© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

انگلستان کے مشہور افسانہ نگار سٹیونسن (STEVENSON) نے یوں تو بیشمار کہانیاں ایسی لکھی ہیں جن میں ضمیر کی کشمکش کو نہایت ہی عمدہ طریقے سے واضح کیا گیا ہے مگر اس کی جس کہانی کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے وہ مارکھیم (MARKHEIM) ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار مارکھیم ایک شریفانہ زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے لیکن اُسے اتنی دولت ہاتھ نہیں آتی جس سے وہ اپنے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ چنانچہ وہ اپنے اس نیک مقصد کے حصول کیلیے ایک دکاندار کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دولت کو حاصل کر لینے کے بعد وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گا۔ اُس کے دل میں اس دکاندار کے خلاف کسی قسم کا کوئی بغض و عناد نہیں وہ محض ایک اچھے مقصد کے لیے اس بری حرکت کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے اس فعل پر نادم بھی ہے مگر اسے ناگزیر بھی خیال کرتا ہے۔ اسی اثناء میں جب وہ قتل کر چکا ہے اُس کا اپنا ضمیر ایک انسانی پیکر میں اُس کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اسے اس بات پر اُکساتا ہے کہ تم اس دکاندار کی ملازمہ کو بھی قتل کر دو تاکہ تمہارا یہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ اس پر مارکھیم یہ کہتا ہے کہ میں نے دکاندار کو تو ایک ضرورت کے تحت قتل کیا تھا لیکن میں اب ملازمہ پر ہاتھ کیوں اٹھاؤں۔ اس کا ضمیر پھر اُس کی توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہے کہ تمہیں محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کے لیے اس کام کو بھی کرنا ہی ہوگا مارکھیم اس میں تامل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا یہ قتل کا فعل بُرا ہی سہی مگر مجھ میں نیکی اور شرافت کے سارے احساسات ختم تو نہیں ہوئے۔ میں اس بیگناہ پر ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کا ضمیر اُسے اشاروں میں سمجھاتا ہے کہ جس طرح تم نے بے گناہ دکاندار کو ایک اچھے مقصد کی خاطر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اسی طرح یہ کام بھی کر ڈالو اور پھر اطمینان سے زندگی بسر کرو مگر مارکھیم آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ پھر اسے اس کا ماضی یاد دلاتا ہے کہ تم وہ وقت یاد کرو جب تمہیں جھوٹ سے نفرت تھی، اور پھر تم نے اسے بولنا شروع کیا، اس کے بعد تم نے چوری شروع کی اور اب قتل جیسے ظالمانہ فعل کا ارتکاب کیا ہے حالانکہ چند سال پہلے قاتلوں کی محض تصاویر دیکھنے سے تمہارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ یہ ہے تمہارے انحطاط کا راستہ۔

اس کہانی کے فنی پہلوؤں سے قطع نظر اس میں جس بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ نیک مقاصد کا حصول اُسی صورت ممکن ہے جب ذرائع نیک ہوں۔ اگر آپ کسی اچھے نصب العین کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس کے لیے اچھے ذرائع بھی اختیار کریں۔ اصلاحِ حال کے لیے جو مختلف طریقے کام میں لائے جاتے ہیں وہ بذاتِ خود اصلاح کا نہایت ہی ضروری جزو ہوتے ہیں اور انہیں نظرانداز کر کے اگر مخلصانہ کوشش بھی کی جائے تو اصلاحِ حال کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔

اہلِ یورپ برسہا برس سے مساوات، آزادی اور اخوت کی تعلیم دیتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوششیں بھی کی ہیں لیکن اس خواب کی عملی تعبیر جب ہمارے سامنے آتی ہے تو وہ سخت گھناؤنی دکھائی دیتی ہے

اس دلکش نعرہ سے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اہلِ یورپ امن و امان کی ایک ایسی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام انسان انسانیت کی بنا پر ایک جیسے سلوک کے مستحق ہوں وہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں بندھے ہوئے ہوں، آزادی اُن کا پیدائشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حق ہوا ور اس عزو شرف کو دنیا کی کوئی قوت سلب نہ کر سکے۔ یہ نعرہ کتنا صحیح اور فطرت انسانی کے قریب ہے لیکن سوچیے آخر اس نعرہ کے علمبرداروں کو اس نیک مقصد کے حصول میں ناکامی کیوں ہوئی۔ وہ لوگ جو دنیا کو انسانی مساوات کا درس دینے کے لیے اٹھے تھے انہوں نے گورے اور کالے کی تمیز روا رکھی، وہ جنہوں نے انسانی اخوت کا پرچار کیا تھا انہوں نے اپنی قوم کے ماسوا دوسری اقوام سے اتنا ظالمانہ سلوک کیا کہ اگر اسے درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جاتا تو وہ شرم کے مارے اپنی گردنیں جھکا دیں، وہ جنہوں نے آزادی کی دہائی دی تھی۔ انہوں نے مشرقی قوموں کو تاخت و تاراج کیا، نہ صرف اُن کی دولت لوٹی بلکہ اُن کی متاعِ ایمان پر بھی مسلسل یورش کی تاکہ ان کے اندر آزادی حاصل کرنے کی ساری امنگیں ختم ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ اس اندوہناک صورتِ حال کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہے کہ اہلِ مغرب اپنے ان دعاوی میں مخلص نہ تھے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن عقل یہ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ ایک عظیم برِاعظم کی ساری اقوام اس منافقت اور دورنگی کو اپنا قومی شعار بنانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ بات تو کسی حد تک تسلیم ہے کہ ان مختلف اقوام کے عیار اور چالاک لوگ مکر و فریب سے ان قوموں کے اندر قوت و طاقت حاصل کر لیں اور پھر وسائلِ حکومت کو کام میں لا کر افراد کو غلط راہوں پر ڈال دیں لیکن طبیعت اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ اس نوع کا اختلاط کا یہ وسیع کام قوم کی معتد بہ اکثریت کی مرضی کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اہلِ یورپ کی اس مقدس مشن میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جسے سٹیونسن نے مارخیم کی مختصر کہانی میں بیان کیا ہے۔ یعنی اگر مقاصد نیک بھی ہوں لیکن حیث تک اُن کے حصول کے لیے نیک ذرائع اختیار نہ کیے جائیں انسان کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ اب اسی نعرہ کو لیجیے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی مساوات، اخوت و آزادی۔ اگر یہ تینوں انسان کے پیدائشی حقوق ہیں جن سے وہ فطری طور پر نوازا گیا ہے تو پھر اس میں عرب و عجم، مغرب و مشرق یا گورے اور کالے کی قطعاً کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان کو انسانیت کے ایک فرد کی حیثیت سے پیدائش کے وقت یہ حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ وطن، رنگ و نسل، یا زبان کے کسی امتیاز کی بنا پر کسی انسان کو ان سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق انسانیت کی حد تک یہ حقوق ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ اب جو فرد، گروہ یا قوم دنیا میں اس دعوے کے ساتھ اٹھے کہ جن انسانوں کے یہ حقوق سلب کیے گئے ہیں انہیں اُسے واپس دلوانا ہے اور اس کام کو ہی وہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد خیال کرے اُسے سب سے پہلے اپنے دل سے "من و تو" کی تمیز مٹانا ہو گی اور اپنے آپ کو وقتی فائدوں اور مصلحتوں سے بلند کر کے اس عظیم خدمت کے لیے تیار کرنا ہو گا۔ پھر اس کے لیے وہ اسی نوعیت کی عملی تدابیر اختیار کرے گی جن میں گروہی اور وطنی عصبیت اور نسلی تفوق کا کوئی شائبہ تک نہ ہو۔ اس آفاقی نقطۂ نظر اور خالص اخلاقی اور انسانی طرزِ عمل ہی سے انسانیت کو آزادی، مساوات اور اخوت کے حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک قوم دعویٰ تو ان انسانی حقوق کا کرے لیکن اُس کے فکر و عمل کے پیچھے تنگ نظری، تعصب اور خود غرضی کارفرما ہو تو پھر وہ اس مقدس مقصد میں نیک تمناؤں اور آرزوؤں کے باوجود کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ (WHITE HEAD) نے مذہب کی تعریف کرتے ہوئے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آفاقی نقطۂ نظر اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان مادی نفع و نقصان سے بلند ہو کر سوچے اور اُس کا اپنے مادی ماحول سے تعلق تو ہو مگر وہ اس کے خم و پیچ میں گرفتار نہ ہونے پائے۔ پروفیسر موصوف نے یہ بات اگرچہ مذہب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ضمن میں کہی ہے لیکن اسی میں اُس نے مغربی فکر و عمل کے تضاد کی بھی نہایت اچھے طریق سے نشاندہی کردی ہے۔ اہلِ مغرب دنیا کو تعلیم تو آزادی، مساوات اور اخوت کی دیتے ہیں، لیکن اس کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ پوری نوع انسانی ان نعمتوں سے اسی وقت متمتع ہو سکتی ہے جب ان کی حفاظت و پاسبانی کرنے والے لوگ قومی اور نسلی تعصبات سے پاک ہوں اور وہ صرف انسانیت کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی بنائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقدس مشن اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کے علمبرداروں کا اس کائنات اور اس کی ساری اشیاء کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل ہو جائے۔ اس مشن کو اپنا لینے کے بعد ان کا فرض ہے کہ وہ کامیابی کے معیار اور اشیاء و افعال کے متعلق مادی نقطۂ نظر ترک کردیں اور انہیں وزن کرنے اور ان کی تقویم کے لیے ایسی میزان اور ایسا مقوم تیار کریں جن سے اس مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہو۔

مگر مغرب میں جو کچھ فی الواقع ہوا ہے وہ اس مقصد کی عین ضد ہے۔ اہلِ مغرب نے مارکھیم کی طرح آفاقی مقاصد کو نسلی اور قومی تعصبات کے ذریعہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی وہ دنیا میں مساوات کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں مگر مادی فوائد و لذائذ کی پرستش نے انہیں اتنا تنگ نظر بنا دیا ہے کہ وہ دنیا کے سارے منافع اپنی ذات کے لیے اور اپنی قوم کے لیے سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر انہوں نے خیر و شر کے سارے معیار مرتب کیے ہیں۔ چنانچہ مساوات کی عملی تعبیر اب اُن کے نزدیک یہ قرار پائی ہے کہ خود اُن کی اپنی قوم کے مختلف افراد میں تو مساوات ہو لیکن جو لوگ اُن کے وطن یا اُن کی نسل سے تعلق نہیں رکھتے انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔

اسی طرح آزادی کے معنی بھی اُن کے نزدیک یہی ہیں کہ ان کی اپنی قوم آزاد ہو اور باقی ساری اقوام کو ان کی خدمت اور چاکری کے لیے غلام بنا دیا جائے۔ یہ ایک ایسا فکری اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وعملی تضاد ہے جس میں مغرب کا ہر انسان اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے محرکات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تبدیلی کا سب سے بڑا محرک انسان کی دنیا پرستی ہے۔ اہلِ مغرب پر سے جس دن سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے وہ اسی روز سے اس تضاد کا شکار چلے آرہے ہیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت انسانی فطرت کی پکار ہیں۔ انسانی ضمیر جب بھی بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے ان پیدائشی حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ انسان ان حقوق کا شعور حاصل کرنے کے بعد اس حقیقت کا بھی کھوج لگانے کے لیے بیتاب ہوتا ہے کہ وہ ان کا سرچشمہ معلوم کرے۔ وہ بارہا یہ سوال کرتا ہے کہ اگر میرے یہ حقوق مستقل اور پیدائشی ہیں تو پھر ان کا سرچشمہ ریاست، حکومت یا انسان سے کوئی ماورا ذات ہے اور اگر مجھے افراد یا انسانی اداروں نے ان سے نوازا ہے تو پھر میرا یہ کہنا کہ یہ پیدائشی ہیں، سراسر باطل ہے۔ ان حقوق کا مستقل اور انسانوں کے لیے پیدائشی ہونا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے تو پھر ان کے حصول اور حفاظت اور پاسبانی کے لیے بھی خدا کے پیش کردہ قوانین و ضوابط کی پابندی کرنی چاہیے۔ اہلِ مغرب نے ان خدائی حقوق کے حصول اور حفاظت کے لیے دنیاوی ضابطوں کی پابندی کرنا چاہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے افکار و اعمال میں زبردست اختلال پیدا ہوگیا۔ ایک مغربی مفکر اینڈرو کانوے نے اس فکری انتشار کی بڑے عمدہ طریق سے مندرجۂ ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے:۔

”انسانوں میں آزادی اور مساوات کا تصور اسی وقت صحیح معنوں میں پنپ سکتا ہے جب انہیں خدا کی مخلوق کی حیثیت سے دیکھا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا کی نظر میں وہ سب برابر ہیں۔ اگر خدا کے وجود اور اخلاقی قوانین کی عملداری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا انکار کر دیا جائے تو پھر غلامی کے خلاف جباری اور قہاری کے خلاف، اور ناجائز انتفاع کے خلاف کوئی دلیل بھی صحیح قرار نہیں دی جا سکتی۔ اگر انسان کسی مستقل عزوشرف کا مالک نہیں، اگر اسے ارادہ و اختیار کی کوئی مستقل آزادی حاصل نہیں، اگر اس کے مستقل حقوق اور فرائض نہیں۔ یہ سب چیزیں خارج سے کسی فرد یا گروہ نے اُسے وقتی طور پر عطا کی ہیں تو اس صورت میں اگر وہ چالاک اور عیار لوگوں کے ہاتھوں میں غلام بن جاتا ہے اور وہ اس کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ وہ حقوق جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں وہ خود خدا ہی سلب کر سکتا ہے۔ لیکن وہ حقوق جو انسان کو انسان نے یا کسی انسانی ادارے نے دے رکھے ہیں تو یہ انسان یا ادارے جب چاہیں واپس لینے کے پوری طرح مجاز ہیں۔ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ کوئی مستقل حقوق انسان کو خدا نے عطا کیے ہیں، اس وقت تک یہ کہنا بے معنی ہے کہ انسان بعض ایسے حقوق رکھتا ہے جنہیں کوئی انسانی ادارہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کیا انسانی اخوت محض ایک رعایت ہے جو مادہ پرستانہ نظریات کی حامل ریاست (جس کا رہنما اصول وقتی مصلحت ہے) نے انسان کو دے رکھی ہے یا اسے انسانوں نے خدا کے عیال کی حیثیت سے حاصل کیا ہے۔ کس نظریہ میں زیادہ پائیداری اور استواری ہے؟ کیا آزادی کا تصور روح کی آزادی، ارادہ و اختیار کی آزادی سے پیدا ہوتا ہے یا اسے ایک مادہ پرستانہ معاشرہ ایک رعایت کے طور پر لوگوں کو دیتا ہے۔ ایک انسان جو ریاست کا بے بس غلام ہے اُس کے اعمال و افعال پر آزادی کا اطلاق کس طرح کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا سکتا ہے۔

"انسانی عزو شرف کے پیدائشی حق کو تسلیم کیے بغیر اخلاق کے اندر ایک زبردست اختلال رونما ہوتا ہے۔ اگر اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے آگے بڑھا جائے تو ایسی منزل جلد ہی آجاتی ہے جب قومی اور نسلی تفوق کا نظریہ بطور ایک ناگزیر نتیجہ کے ماننا پڑتا ہے"

پروفیسر موصوف نے اس مضمون میں بڑی دیدہ وری سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ آپ جب یہ کہتے ہیں کہ مساوات، اخوت انسانی اور آزادی انسان کے فطری حقوق ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان مستقل حقوق کا سر چشمہ کسی ایسی ذات کو سمجھیں جسے کبھی فنا نہیں اور جو اپنی بقا کے لیے کسی دوسری ہستی کی محتاج نہیں؛ کیونکہ اگر یہ حقوق فانی انسانوں کے عطا کردہ ہیں تو پھر ان کا مستقل اور فطری ہونا محل نظر ہے۔ اور اگر انسان انہیں عطا کرنے کا مجاز ہے تو وہ انہیں سلب کرنے کا بھی پورا پورا حق اور اختیار رکھتا ہے۔ انسان کا یہ وسیع اختیار انکارِ خدا کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔

معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کے اس غیر مسئول اقتدار کا اثر زندگی کے سارے شعبوں پر مرتب ہوتا ہے۔ جب انسان کو دنیا کے معاملات میں "مختارِ کل" مان لیا جائے تو پھر اُس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کرے بالکل بے معنی سی چیز نظر آتی ہے ان حالات میں اُس کے فکر و عمل کا محرک ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ مادی منافع حاصل کرے۔ جس راہ پر چلنے کے بعد وہ اس مقصد کو جلد از جلد حاصل کر سکتا ہے وہی اُس کے نزدیک نیکی اور اخلاق ہے اور جس سے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو وہ اُس کی نظر میں برائی اور عیب ہے۔ وہ پھر اخلاق کی مستقل اقدار پر ایمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں رکھتا بلکہ اُس کے خیر و شر کے پیمانے مادی "فلاح و بہبود" کے ساتھ ہر آن بدلتے رہتے ہیں وہ مارکھیم کی طرح اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں اصل نیکی صرف مقصد کا حصول ہے اور اس کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کیے جائیں وہ سارے درست اور مبنی بر انصاف ہیں۔ اگر دولت چوری کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو اس کا ارتکاب کر لیا جائے اور اگر قتل کرنے اور ڈاکہ ڈالنے سے اس کا حصول ممکن ہو تو پھر ان ظالمانہ افعال کے کرنے میں بھی کوئی تامل نہ کیا جائے۔ اسی مضمون کو پروفیسر صاحب نے ایک دوسرے مقام پر بڑی صراحت سے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ اصول کہ ریاست کی فلاح انتہائی نیکی ہے اور اس کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کیے جائیں وہ صحیح اور درست ہیں۔ یہ وہ الجھن ہے جس میں اہل جرمنی گرفتار ہیں۔ آخر اُن لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اُن حضرات کو گردن زدنی سمجھیں جنہوں نے نازی قانون کے احترام میں لوگوں پر دستِ ظلم دراز کیا۔ اگر انہیں سزا کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے تو صرف اُسی صورت میں جب یہ مان لیا جائے کہ خدا نے انسانی اعمال کے متعلق کچھ اخلاقی ضابطے بھی مقرر فرمائے ہیں۔ اگر انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون اُس کے حقوق کی اصل بنیاد ہے تو پھر ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم نازیوں کے یہودیوں پر ظلم و ستم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اشتراکی حکومتوں میں کوئی انسان کسی مستقل حق کا مالک نہیں۔ اگر انسانوں کے فی الواقع دنیا میں کوئی مستقل حقوق موجود ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہیں کس ذات نے استقلال بخشا۔ اگر انسان اس کائنات کا خالق نہیں تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کو مستقل طور پر عز و شرف کے لازوال خزائن عطا کرے اور انہیں دائمی حقوق سے نوازے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروفیسر صاحب نے جو زوردار الفاظ نازیوں اور اشتراکیوں کے متعلق استعمال کیے ہیں وہ اگرچہ خود اپنی الجھنوں کے متعلق نہیں کہے لیکن انہوں نے امریکی قوم کے انحطاط کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے اور نہایت کھلے طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہماری زندگی کا یہ تضاد کہ ایک طرف ہم انسانوں کے کچھ مستقل حقوق بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دوسری طرف ان حقوق کے عطا کرنے والی ذات کے ضابطوں کی پابندی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے — اس نے ہمیں بربادی کی راہ پر ڈال دیا ہے:

"امریکی زندگی کا مطالعہ اس امر کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت روبہ انحطاط ہے۔ امریکی زندگی الحاد کے زیرِ اثر آ رہی ہے اور اس کی روحانی اور مذہبی بنیادیں آہستہ آہستہ منہدم ہوتی جا رہی ہیں۔ دنیائے مغرب ایک عجیب و غریب تضاد کا شکار ہے۔ وہ انسانوں کے مستقل اور پائیدار حقوق کو ان کے روحانی سرچشموں سے بھی منقطع کر رہی ہے اور پھر اس کے ساتھ ان کی حفاظت اور پائیداری کا بھی التزام کرنا چاہتی ہے۔"

یہ تضاد جس کی طرف پروفیسر صاحب نے اشارہ کیا ہے اس میں صرف دنیائے مغرب ہی گرفتار نہیں بلکہ دنیائے مشرق بھی اسی مرض میں مبتلا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دنیائے اسلام میں اس تضاد نے ایک افسوسناک انتشار کی صورت اختیار کر رکھی ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اسی انتشار نے مسلم قوم کو انحطاط کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری ترقی اور خوشحالی کی ساری تدابیر ناکام و نامراد رہتی ہیں۔

ہم دنیا کو اپنے دعووں سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم قوم ایسے مقدس مقاصد کی علمبردار ہے جنہیں مادی فلاح و بہبود کے پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نصب العین کے لحاظ سے روحانی اقدار اور اخلاقی ضابطوں کی پابند ہے، اسے رنگ و نسل، زبان اور وطن کے امتیازات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دعاوی اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہیں لیکن انہیں محض زوردار الفاظ میں پیش کر دینے سے تو مقصد حل نہیں ہوتا۔ ہمارے یہ دعاوی ہم سے بعض مطالبات کرتے ہیں جن میں سب سے اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہم جس اسلام کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اس پر ہمیں خود بھی اعتماد ہو، نہ صرف اعتماد ہو بلکہ اسی کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو۔ اسلام کو ہم ایک سیاسی سٹنٹ کے طور پر استعمال نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ ہم صحیح معنوں میں عقیدت رکھیں، اس کے اصول اور ضابطوں کی پابندی میں اپنی اور پوری نوعِ بشری کی فلاح سمجھیں اور ہر لمحہ اس بات کے آرزومند رہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے پیش کردہ سانچوں کے مطابق ڈھالیں۔ اسلام پر ایمان لانے کے یہ بالکل بنیادی اور اساسی تقاضے ہیں۔ اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم جتنی مخلصانہ کوشش کریں گے وہی ہماری اسلام سے محبت اور عقیدت کا صحیح پیمانہ ہو گا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنا اور پوری مسلم قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم اسلام سے اپنی محبت کے معاملے میں مخلص نہیں ہیں۔ اسلام سے ہمیں وابستگی تو ضرور ہے لیکن یہ وابستگی اتنی ہی ہے جتنی کہ خود اسلام میں تغیر پذیری کی صلاحیت۔ یہ زبان کی حد تک ہماری عقیدت کا مرکز و محور ہے لیکن عملی طور پر یہ ہمارا خادم ہے، جیسے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اتنا ہی دخل حاصل ہے جس کی ہم نے اسے اجازت دے رکھی ہے۔ اسے زندگی کا مقصود و مطلوب بنانے کی بجائے اب ہم نے ایک آلۂ کار بنا لیا ہے۔ یہ اب ہمارے ہاتھوں میں بے بس غلام ہے۔ ہمارا اصل مقصد اب معاشی فلاح و بہبود ہے اور اگر اس مقصد کے حصول میں اس سے کوئی خدمت لی جا سکتی ہو تو بہتر ورنہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر کے بلکہ راہ کا سنگِ گراں سمجھتے ہوئے راستے سے ہٹایا

(باقی ص ۵۹ پر)

© rasailojaraid.com